POSTED AT NDPSO ON 10-11 JUNE 2002
U (C) 160/2002 TO POST WITHOUT PREPAYMENT
POSTAL REGN. NO. DL-11186/2002 R.N.I NO. 2186/57

HAMARI ZABAN (WEEKLY) ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

۱۵ تا ۲۱ جون ۲۰۰۲ء (15-21 JUNE 2002)
شمارہ نمبر: ۲۳ جلد نمبر: ۶۱

ترقی پسند شعرا وادبا کے ہشاش بشاش، بارونق اور بے بہار چہرے بھی اداسی اور افسردگی کی اندوہناک لہر اس وقت اٹھی جب اردو افسانہ نگاری اور ناول نویسی کے سرخیل اور روح رواں کرشن چندر کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد رومان اور انقلاب کے ملے جلے ساز پر خوب صورت اور دل میں اتر جانے والی شاعری کی دھن چھیڑنے والے اردو کے ہراول دستے کے شاعر جاں نثار اختر کی روح فرسا موت واقع ہوئی۔ ان کی موت سے ترقی پسند شعرا اور مصنفین کے خیمے میں اداسی کی لہر میں اور بھی شدت پیدا ہوئی۔ پھر کیا تھا ادیبوں اور شاعروں کی موت کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ موت نے جیسے ان کا گھر دیکھ لیا ہو۔ ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، ع۔ انصاری،

ہے کہ اب وہ کسی شاعر کے قریب آتے ہوئے بھی گھبرائے گی۔ ان کی ہمت کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی تھا کہ ایسی جان لیوا بیماری کا شکار ہونے کے باوجود انھوں نے میجواں (Mejwan) جیسے دور افتادہ گاؤں میں پچیس سال کا طویل حصہ تنہائی کے عالم میں گزار دیا۔ لیکن ادھر وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ کئی بیماریوں نے ایک ساتھ ان پر حملہ کیا تھا۔ آخر آخر میں دمہ کا شدید حملہ ہوا۔ سینے میں تکلیف (Chest Infection) کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ ان کے گھر کے لوگوں نے علاج کے سلسلے میں انھیں ۲۸ مارچ کو جسلوک ہاسپٹل میں داخل کر دیا تھا۔ ۹ مئی کو اخبارات میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ کیفی صاحب کی بہتر حالت کے تحت انھیں I.C.U سے نکال لیا گیا ہے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور

کیفی اعظمی کی یاد میں

محمد ایوب واقف (منگل اسٹیشن بی-فلیٹ نمبر ۳۰۴، چوتھا منزل، سیکٹر نمبر ۱۲، کوپر کھیرانے، نئی ممبئی-۴۰۰۷۰۹)

مجروح سلطانپوری اور علی سردار جعفری دیکھتے دیکھتے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اردو کی بہت ہی ورانی آواز اور گھن گرج کے شاعر کیفی اعظمی کا دم غنیمت تھا۔ وہ ترقی پسند نسل کے سربرآوردہ شعرا کی آخری کڑی کی شکل میں ہمارے پاس موجود تھے لیکن ۱۰ مئی کی منحوس صبح کو وہ کڑی بھی ٹوٹ گئی۔ ایک گلاب نما (Rosaceous) زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

کیفی اعظمی پر فالج کا شدید حملہ تقریباً ۲۵ سال پہلے ہوا تھا۔ لیکن فالج کے اس شدید حملے کے بعد بھی حسب معمول وہ اپنے کاروبار زندگی میں پوری طرح مصروف و منہمک تھے۔ انھوں نے بیماری کے احساس کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں منعقد ہونے والے مشاعروں اور سیمیناروں میں ان کی شرکت پہلے کی طرح جاری تھی۔ ان کی اس عدیم المثال ہمت اور حوصلہ مندی کو دیکھ کر مشہور شاعر اور نقاد مرحوم علی سردار جعفری نے کہا تھا کہ فالج کی بیماری کو کیفی صاحب نے جس پامردی اور مستقل مزاجی کے ساتھ شکست دی ہے اس کے پیش نظر اس بات کا یقین

منظور تھا۔ ۱۰ مئی کو صبح ساڑھے چھ بجے وہ عدم کو سدھار گئے۔ کیفی صاحب کی موت سے ایک پورے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ اردو کے اس مشہور اور لیجنڈری حیثیت کے مالک شاعر کا انتقال کے روز ہی تقریباً ساڑھے پانچ بجے اندھیری (مغرب) کے چار بنگلہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کے ساتھی شعرا وادبا جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس، مجروح سلطانپوری اور سردار جعفری وغیرہ سانتا کروز کے قبرستان میں پیوند خاک ہوئے۔ کیفی صاحب شاید تنہا شاعر تھے جن کی تدفین اندھیری کے قبرستان میں ہوئی۔

کیفی صاحب نے عمر کی آخری دو دہائیوں میں اپنے گاؤں میجواں سے اپنا رشتہ بہت استوار کر لیا تھا۔ سردی ہو یا گرمی ان کا زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔ وہاں انھوں نے اپنے پرکھوں کی ملکیت والی زمین سرکاری چارہ جوئی سے واپس لینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس حاصل شدہ اراضی کے ایک حصے پر انھوں نے خوب صورت بنگلہ بنوایا تھا۔ وہاں کے مشہور قصبہ پھولپور سے لے کر کیفی صاحب کے گاؤں تک ایک پختہ سڑک بھی یوپی سرکار نے تعمیر کروا دی تھی۔ اس سڑک کا نام کیفی روڈ ہے۔ اس سڑک سے منسلک ایک دوسری سڑک بھی تعمیر کی گئی ہے اس کا نام شبانہ روڈ رکھا گیا ہے۔

اپنے بنگلے سے ملحقہ ایک قطعہ اراضی پر کیفی صاحب نے آم کا ایک باغ بھی لگوایا۔ ان کے بنگلے سے قریب اطراف کے بچوں کے لیے ایک سرکاری اسکول بھی کیفی صاحب کی کوششوں سے قائم کروایا گیا ہے، یہاں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بچے کافی بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ ایک ملاقات کے دوران کیفی صاحب سے میں نے کہا کہ اگر وہ کوشش کریں تو اس علاقے میں ایک کالج بھی کھل سکتا ہے۔ انھیں میرا یہ مشورہ پسند آیا تھا لیکن وہاں کے اسکول اور کالج کی ترقی کے لیے میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ اپنے اثرات کا استعمال کر کے کچھ

جگن ناتھ آزاد

ایک نظم

(گجرات کے پس منظر میں)

میں تو ہوں روحانیت کی بات کو بھولا ہوا — پوچھتا ہوں اے زمینِ ہند تجھ کو کیا ہوا
اپنے درسِ آدمیت پر جنھیں اب تک ہے ناز — آدمی کے جسم سے دیکھیں لہو بہتا ہوا
مجھ کو کیا حاصل جو تم نے کر لیا گنگا کو صاف — ملک کا دل تو غلاظت ہی میں ہے ڈوبا ہوا
صاف کیا ہوگا کہ اب پانی کا یہ دریا نہیں
دیکھتی ہیں اس میں اب نظریں لہو بہتا ہوا
پوچھتا ہے تجھ سے بھی اتنا ہی اے آئینہ گر — جڑ سکا تجھ سے نہ گر یہ آئینہ ٹوٹا ہوا
میرے استفسار پر آئی صدا یہ غیب سے — مکر و فن کا سلسلہ ہے دور تک پھیلا ہوا
بوئے گل ویرانوں سے پوچھتی پھرتی تھی کل
اس جگہ مہکا ہوا تھا اک چمن وہ کیا ہوا
اے مسافر! دیکھنے آیا ہے کیا اس دیس میں — عورتوں کا قتل بچوں کا لہو بہتا ہوا
تیز نیزوں کی انی پر پھول سے بچوں کے سر — زندہ انسانوں کو پیہم آگ میں جلتا ہوا
کیا کرے گا دیکھ کر تو ہند کے دریا، پہاڑ — بستیوں میں دیکھ گھر گھر سے دھواں اٹھتا ہوا
زندگی سے اب تو اے آزاد شرم آنے لگی
میں بھی آ کر عمر کے کس دور میں رسوا ہوا

POSTED AT NDPSO ON 10-11 JUNE 2002
U (C) 160/2002 TO POST WITHOUT PREPAYMENT
POSTAL REGN. NO. DL-11186/2002 R.N.I NO. 2186/57

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

۱۵ر تا ۲۱ رجون ۲۰۰۲ء (15-21 JUNE 2002)

شمارہ نمبر: ۲۳ جلد نمبر: ۶۱

کیفی اعظمی کی یاد میں

محمد ایوب واقف (منگل اشیش-سی-بی-فلیٹ نمبر ۲۰۳، چوتھا منزلہ، سیکٹر نمبر ۱۲، کوپر کھیرنے، نئی ممبئی-۴۰۰۷۰۹)

ترقی پسند شعرا و ادبا کے بشاش بشاش، بارونق اور پُربہار چہرے میں اداسی اور افسردگی کی اندوہناک لہر اس وقت اٹھی جب اردو افسانہ نگاری اور ناول نویسی کے سرخیل اور روحِ رواں کرشن چندر کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد رومان اور انقلاب کے ملے جلے ساز پر خوب صورت اور دل میں اتر جانے والی شاعری کی دھن چھیڑنے والے اردو کے ہر دل عزیز شاعر جاں نثار اختر کی روح فرسا موت واقع ہوئی۔ ان کی موت سے ترقی پسند شعرا اور مصنّفین کے خیمے میں اداسی کی لہر میں اور بھی شدت پیدا ہوئی۔ پھر کیا تھا ادیبوں اور شاعروں کی موت کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ موت نے جیسے ان کا گھر دیکھ لیا ہو۔ ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، ظ۔ انصاری، مجروح سلطانپوری اور علی سردار جعفری دیکھتے دیکھتے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اردو کی بہت ہی ورانی آواز اور گھن گرج کے شاعر کیفی اعظمی کا دم غنیمت تھا۔ وہ ترقی پسند نسل کے سربرآوردہ شعرا کی آخری کڑی کی شکل میں ہمارے پاس موجود تھے لیکن ۱۰ رمئی کی منحوس صبح کو وہ کڑی بھی ٹوٹ گئی۔ ایک گلاب نما (Rosaceous) زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

کیفی اعظمی پر فالج کا شدید حملہ تقریباً ۲۰ سال پہلے ہوا تھا۔ لیکن فالج کے اس شدید حملے کے بعد بھی حسب معمول وہ اپنے کاروبارِ زندگی میں پوری طرح مصروف و متحرک تھے۔ انھوں نے بیماری کے احساس کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں منعقد ہونے والے مشاعروں اور سیمناروں میں ان کی شرکت پہلے کی طرح جاری تھی۔ ان کی اس عدیم المثال ہمت اور حوصلہ مندی کو دیکھ کر مشہور شاعر اور نقاد مرحوم علی سردار جعفری نے کہا تھا کہ فالج کی بیماری کو کیفی صاحب نے جس پامردی اور مستقل مزاجی کے ساتھ شکست دی ہے اس کے پیش نظر اس بات کا یقین ہے کہ اب وہ کسی شاعر کے قریب آتے ہوئے بھی گھبرائے گی۔ ان کی ہمت کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی تھا کہ ایسی جان لیوا بیماری کا شکار ہونے کے باوجود انھوں نے میجواں (Mejwan) جیسے دور افتادہ گاؤں میں پچیس سال کا طویل حصہ تنہائی کے عالم میں گزار دیا۔ لیکن ادھر وہ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ کئی بیماریوں نے ایک ساتھ ان پر حملہ کیا تھا۔ آخر آخر میں دمے کا شدید حملہ ہوا۔ سینے میں تکلیف (Chest Infection) کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ ان کے گھر کے لوگوں نے علاج کے سلسلے میں انھیں ۲۸ر مارچ کو جسلوک ہاسپٹل میں داخل کر دیا تھا۔ ۹ر مئی کو اخبارات میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ کیفی صاحب کی بہتر حالت کے تحت انھیں I.C.U سے نکال لیا گیا ہے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ۱۰ر مئی کو صبح ساڑھے چھ بجے وہ عدم کو سدھار گئے۔ کیفی صاحب کی موت سے ایک پورے دور کا خاتمہ ہوگیا۔ اردو کے اس مشہور اور لیجنڈری حیثیت کے مالک شاعر کو انتقال کے روز ہی تقریباً ساڑھے پانچ بجے اندھیری (مغرب) کے چار بنگلہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے ساتھی شعرا و ادبا جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس، مجروح سلطانپوری اور سردار جعفری وغیرہ سانتا کروز کے قبرستان میں پیوندِ خاک ہوئے۔ کیفی صاحب شاید تنہا شاعر تھے جن کی تدفین اندھیری کے قبرستان میں ہوئی۔

کیفی صاحب نے عمر کی آخری دو دہائیوں میں اپنے گاؤں میجواں سے اپنا رشتہ بہت استوار کر لیا تھا۔ سردی ہو یا گرمی ان کا زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔ وہاں انھوں نے اپنے پرکھوں کی ملکیت والی زمین سرکاری چارہ جوئی سے واپس لینے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ اس حاصل شدہ اراضی کے ایک حصے پر انھوں نے خوب صورت بنگلہ بنوایا تھا۔ وہاں کے مشہور قصبہ پھولپور سے لے کر کیفی صاحب کے گاؤں تک ایک پختہ سڑک بھی یوپی سرکار نے تعمیر کروادی تھی۔ اس سڑک کا نام کیفی روڈ ہے۔ اس سڑک سے منسلک ایک دوسری سڑک بھی تعمیر کی گئی ہے اس کا نام شبانہ روڈ رکھا گیا ہے۔

اپنے بنگلے سے ملحقہ ایک قطعہ اراضی پر کیفی صاحب نے آم کا ایک باغ بھی لگوایا۔ ان کے بنگلے سے قریب اطراف کے بچوں کے لیے ایک سرکاری اسکول بھی کیفی صاحب کی کوششوں سے قائم کروایا گیا ہے، یہاں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بچے کافی بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ ایک ملاقات کے دوران کیفی صاحب سے میں نے کہا کہ اگر وہ کوشش کریں تو اس علاقے میں ایک کالج بھی کھل سکتا ہے۔ انھیں میرا یہ مشورہ پسند آیا تھا لیکن وہاں کے اسکول اور کالج کی ترقی کے لیے میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ اپنے اثرات کا استعمال کرکے کنور

جگن ناتھ آزاد

ایک نظم

(گجرات کے پس منظر میں)

میں تو ہوں روحانیت کی بات کو بھولا ہوا　پوچھتا ہوں اے زمینِ ہند تجھ کو کیا ہوا
اپنے درسِ آدمیت پر تجھیں اب تک ہے ناز　آدمی کے جسم سے دیکھیں لہو بہتا ہوا
مجھ کو کیا حاصل جو تم نے کر لیا گنگا کو صاف　ملک کا دل تو غلاظت ہی میں ہے ڈوبا ہوا
صاف کیا ہوگا کہ اب پانی کا یہ دریا نہیں
دیکھتی ہیں اس میں اب نظریں لہو بہتا ہوا
پوچھتا ہے تجھ سے بھی اتنا ہی اے آئینہ گر　بچ سکا تجھ سے نہ گر یہ آئینہ ٹوٹا ہوا
میرے استفسار پر آئی صدا یہ غیب سے　مکر و فن کا سلسلہ ہے دور تک پھیلا ہوا
بوئے گل ویرانیوں سے پوچھتی پھرتی تھی کل
اس جگہ مہکا ہوا تھا اک چمن وہ کیا ہوا
اے مسافر دیکھنے آیا ہے کیا اس دیس میں　عورتوں کا قتل بچوں کا لہو بہتا ہوا
تیز نیزوں کی انی پر پھول سے بچوں کے سر　زندہ انسانوں کو بھیم آگ میں جلتا ہوا
کیا کرے گا دیکھ کر تو ہند کے دریا پہاڑ　بستیوں میں دیکھ گھر گھر سے دھواں اٹھتا ہوا
زندگی سے اب تو اے آزاد شرم آنے لگی
میں بھی آکر عمر کے کس دور میں رُسوا ہوا

ندی پر پل بھی بنوائیں تاکہ برسات کے موسم میں اطراف کے طالب علموں کے آنے جانے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ انھوں نے ان منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے اقدامات بھی کیے تھے لیکن اب ان کے انتقال سے ان سارے کاموں کی انجام دہی میں شاید رکاوٹیں آئیں گی۔ لیکن اگر ان کی لائق وفائق بیٹی شبانہ اعظمی جو خوش قسمتی سے راجیہ سبھا کی رکن بھی ہیں، کیفی صاحب کے چھوڑے ہوئے کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تو یہ سارے منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں۔

میں یہ بات پہلے عرض کرچکا ہوں کہ مجواں کیفی صاحب کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ یہاں سے ان کی دل چسپی اور لگاؤ کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے زندگی بھر جو کتابیں ممبئی میں جمع کی تھیں ان تمام کتابوں کو بڑی حفاظت سے مجواں منتقل کروادی تھیں۔ پچھلی بار ۱۹۹۹ء میں جب میں اپنی بڑی بیٹی عفت ایوب کی شادی کرنے اپنے گاؤں پورہ نورم بیساں گیا تھا تو ان سے ملنے مجواں گیا تھا۔ یہ بات دھیان میں رکھیے کہ کیفی صاحب کا گاؤں مجواں اور میرا گاؤں پورہ نورم بیساں قریب قریب واقع ہیں۔ گنور ندی کے شمال میں کیفی صاحب کا گاؤں بسا ہے اور اس کے جنوب میں میرا گاؤں پورہ نورم بیساں (Poorah Nooram Baisa) آباد ہے۔ میں کیفی صاحب کی کتابوں کے ذخیرے (Collection) کی منتقلی کے سلسلے میں بات کررہا تھا۔ مجواں میں میں نے دیکھا کہ کیفی صاحب نے مکان کے ایک کمرے میں کتابیں بہت سلیقے اور قرینے سے علی الترتیب رکھوائی تھیں۔ کتابوں کی تعداد تین ہزار سے کم نہیں ہوگی اور ان ساری کتابوں کی بھورے کاغذ (Brown Papers) سے پر مشتمل کردی گئی تھی۔ ان کتابوں کا کیٹلاگ تیار کرنے کے لیے انھیں ایک اردو جاننے والے کی ضرورت تھی لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود انھیں ایسا کوئی شخص نہیں ملا۔ اترپردیش میں اردو کی یہ صورت حال ہے۔ اس دن میں نے اور کیفی صاحب نے شمالی ہند میں اردو کے حق میں بگڑتے ہوئے حالات پر کافی دیر تک بات کی۔ شبانہ اعظمی کو کیفی صاحب کی ان یادگاروں کو جو مکان، کتب خانہ اور باغ کی شکل میں مجواں میں موجود ہیں سنبھالنا ضروری ہے ورنہ لاکھوں کا یہ سرمایہ تو برباد ہوگا ہی لیکن جو سب سے بڑی بات ہوگی وہ یہ کہ کیفی صاحب کی یہ یادگاریں مٹ جائیں گی۔ مجواں ہی میں ایک ملاقات کے دوران کیفی صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اب تو وہ یہیں کی خاک کا حصہ بنیں گے۔ لیکن ان کی اس خواہش کا پاس ولحاظ نہیں کیا گیا۔ اگر ان کا جسدِ خاکی وہاں کی خاک کے سپرد کیا گیا ہوتا تو اس عمل سے شاید کیفی صاحب کی روح کو بڑا سکون ملتا۔

میں ممبئی میں ۱۹۶۵ء سے مقیم ہوں لیکن کیفی صاحب سے باقاعدہ اور خصوصی ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۸۰ء کے آس پاس قائم ہوا۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں ممبئی کے ایک ہفت روزہ اخبار کی فرمائش پر میں نے ان سے ایک تفصیلی انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو کا ادبی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا۔ اس وقت تازہ تازہ فراق گورکھپوری کا انتقال ہوا تھا۔ میں نے انٹرویو کے دوران ان سے سوال کیا تھا کہ فراق گورکھپوری کی بھرپور علمی وادبی شخصیت کے بعد اردو کا سب سے بڑا فنکار کسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ بڑے غور کے بعد کیفی صاحب نے سردار جعفری کا نام لیا۔ میں نے ان کے اس جواب کو انٹرویو کی سرخی کے طور پر پیش کیا تھا۔ کچھ لوگوں کو اعتراض تھا کہ کیفی اعظمی صاحب نے سردار جعفری کا ہی نام کیوں لیا۔ لیکن کیفی صاحب اس بات پر مصر تھے کہ انھوں نے سردار جعفری کا نام لے کر کوئی غلطی نہیں کی اس لیے کہ وہ پورے برصغیر کے بڑی قد وقامت کے فنکار ہیں۔ انھوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ اگرچہ فیض احمد فیض بہت بڑے اور اہم شاعر ہیں لیکن علم کی جو گہرائی سردار جعفری کے یہاں ہے اس کی کوئی مثال نہیں۔

۱۹۸۲ء کے دسمبر کے مہینے میں میں نے کیفی صاحب کو اپنے غریب خانے پر دعوت دی۔ میری اہلیہ صفیہ ایوب نے یوپی طرز کے مخصوص پکوانوں کا اہتمام کیا۔ کیفی صاحب نے کھانے کی خوب خوب تعریف کی۔ کافی دیر تک وہ ہمارے گھر پر رکے۔ جب گھر جانے لگے تو میری بیوی سے مخاطب ہوکر انھوں نے کہا کہ بی بی ہم آپ کے یہاں دوبارہ دعوت کھانے آئیں گے لیکن دوبارہ جب آئیں گے تو مرغ وغیرہ نہیں بلکہ بتھوا کا ساگ کھائیں گے۔ بتھوا کا ساگ دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں ربیع کی فصل کے ساتھ اگتا ہے۔ یہ خودرو ہوتا ہے اس کے اگانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ کیفی صاحب نے ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ ساگ مٹی کی ہنڈی میں پکنا چاہیے۔ ایک بات آپ کو یہ بتادیں کہ بتھوا کا ساگ ممبئی میں ہر سبزی مارکیٹ میں نہیں ملتا۔ کہیں کہیں اتفاقیہ طور پر یہ دکھائی پڑجاتا ہے۔ بہرحال بڑی تلاش کے بعد ساگ تو مل گیا لیکن مٹی کی نئی ہنڈی کا مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ ہمارے ایک رشتے دار نے یہ مسئلہ بھی حل کردیا۔ وہ اس ہنڈی کو اپنے وطن اعظم گڑھ سے لائے تھے۔ سارا انتظام کرنے کے بعد ہم نے کیفی صاحب کو مطلع کیا اور وہ وقت مقررہ پر ہمارے غریب خانے پر آگئے۔ میری اہلیہ نے ساگ کے ساتھ ساتھ ارہر کی دال اور مرغ کا سالن بھی تیار کیا تھا۔ اپنی پسند کے مطابق انھوں نے مخصوص قسم کی ہاتھ کی سویاں بھی تیار کرلی تھیں۔ کیفی صاحب نے مزے لے لے کر ساگ اور چپاتیاں کھائیں بعد میں انھوں نے چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں رکھی ہوئی سویاں بھی کھائیں۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس دن کیفی صاحب کتنا خوش تھے۔ میری بیوی سے انھوں نے کہا کہ بی بی آج میرا بچپن مجھے یاد آرہا ہے کیوں کہ ہماری آپا اور ہماری والدہ اسی طرح کی سویاں تیار کیا کرتی تھیں۔ ہاں یاد آیا اس دن جب کیفی صاحب میرے گھر آئے تو انھیں دیکھ کر میری بڑی بیٹی جس کی عمر اس وقت تین سال کی تھی اور جس کی اب شادی ہوچکی ہے، کمرے کی کھڑکیوں پر چڑھنے لگی اور تیز تیز رونے لگی۔ کیفی صاحب نے کہا شاید یہ بچی ان کے بڑے بڑے اور بکھرے بکھرے بالوں کو دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ فالج کی وجہ سے ان کے ہاتھ میں بیساکھی بھی رہا کرتی تھی شاید اسے یہ لگا ہو کہ اس بیساکھی سے کیفی صاحب اسے ماریں گے۔ تین سال کی بچی کو خوف زدہ کرنے کے لیے دونوں ہی چیزیں کافی تھیں لیکن بعد میں کیفی صاحب سے وہ مانوس ہوگئی۔ اس کی یہ بات بہت شاید ان ٹافیوں کا کرشمہ رہی ہو جن کو انھوں نے اپنے ڈرائیور سے منگوایا تھا۔

ایک روز کیفی صاحب نے مجھے فون کیا کہ میں جانکی کٹیر آجاؤں۔ واضح رہے کہ وہ جانکی کٹیر جوہو کے ایک بڑے بنگلے میں قیام پذیر تھے۔ میں ان کے گھر پہنچا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ ان دنوں ممبئی میں بڑا سناٹا ہے کہیں کوئی ادبی نشست وغیرہ نہیں ہوتی اگر میں تعاون کروں تو وہ اپنے یہاں پندرہ روزہ ادبی وشعری نشست کے انعقاد کے لیے تیار ہیں۔ میں نے انھیں اس سلسلے میں پورا تعاون فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ دو تین دنوں کے اندر اندر ہم نے پہلی ادبی نشست کی تاریخ مقرر کرکے دعوت نامے لوگوں کو بھیج دیے۔ اس پہلی نشست میں ممبئی کے مشہور ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، خواجہ احمد عباس، سلمیٰ صدیقی اور ظ۔ انصاری جیسے بڑے اور معتبر شعراء وادبا کی موجودگی نے اس خاص ادبی جلسے کو نہ صرف کامیاب بنایا بلکہ یادگار بھی بنادیا۔ اس نشست میں میں نے اور جاوید اختر نے غزلیں پیش کیں اور خواجہ احمد عباس نے ایک افسانہ سنایا۔ اس پہلی کامیاب میٹنگ سے کیفی صاحب بہت خوش ہوئے۔ یہ نشستیں تقریباً چھ مہینے تک چلیں۔ ادبی حلقوں میں ان نشستوں کا چرچا بھی ہونے لگا لیکن بعد میں کچھ میری پریشانیوں اور کچھ کیفی صاحب کی مصروفیتوں نے رکاوٹیں پیدا کردیں نتیجے کے طور پر یہ نشستیں بند ہوگئیں۔ لیکن ممبئی کے اہلِ قلم کے ذہنوں میں ان ادبی نشستوں کی یادیں ابھی بھی تازہ ہیں۔

کیفی اعظمی کی پیدائش ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ جہاں تک ان کی پیدائش کے سال کا سوال ہے ۱۹۱۸ء کا سال ہی درست ہے کیوں کہ اس سنہ کی نشاندہی خود کیفی صاحب نے کی تھی۔ لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ ان کے انتقال کے دوسرے دن ممبئی کے انگریزی اور اردو کے اخبارات میں ان کا سالِ پیدائش الگ الگ تحریر کیا گیا۔ روزنامہ 'انقلاب' نے ان کا سنہ پیدائش ۱۹۲۵ء لکھا، انگریزی اخبار "Assian Age" نے ۱۹۲۲ء تحریر کیا۔ مشہور انگریزی اخبار "The Indian Express" نے ۱۱ رمئی کے شمارے میں دو تحریریں شائع کیں۔ ایک تحریر میں کیفی صاحب کی پیدائش کا سال ۱۹۲۵ء اور دوسری میں ۱۹۱۸ء لکھا گیا۔ جون کمار ورما جنھوں نے کیفی صاحب کی نظموں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، انڈین ایکسپریس میں سالِ پیدائش ۱۹۱۸ء لکھا ہے۔ ان کے سنہ پیدائش کے سلسلے میں اس طرح کا تضاد اس لیے پیدا ہوا ہے کہ اس کے بارے میں احتیاط اور چھان بین سے کام نہیں لیا گیا۔ کیفی صاحب ممبئی میں اقامت پذیر تھے، ایک مدت سے زیادہ عرصے تک وہ ممبئی کے اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ اخبارات اور رسائل سے وابستہ لوگ ان سے رابطہ قائم کرکے کم از کم ان کے سنہ پیدائش کو تو صحیح لکھ ہی سکتے تھے۔ اس کے علاوہ دس سال قبل کیفی صاحب کی شخصیت اور فن پر دہلی کے معیار پبلی کیشنز کی جانب سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی تھی اس میں کیفی صاحب کے قلم سے ان کی مختصر سوانح حیات شامل کی گئی ہے۔ اس بات کا علم کم از کم اردو اخبارات کو تو ہوگا ہی۔ اس صورت حال کے باوجود اس طرح کی غلطی کا سرزد ہونا ہماری کم علمی نہیں تو اور کیا ہے۔ ہماری ان غلط شہادتوں کے سبب آئندہ کے محققین کے لیے دشواریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

جہاں تک کیفی صاحب کی شخصیت کا سوال ہے تو اس سلسلے میں بلا جھجک یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمہ جہت خوبیوں کے مالک تھے اور جہاں تک میری سمجھ اور پرکھ کا سوال ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت کے تین رخ یا تین پہلو بہت ہی اہم تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی شخصیت کے ان تین خاص پہلوؤں میں سب سے خاص پہلو ان کی شاعری پر مشتمل تھا۔ کیفی صاحب نے ایک خاصی طویل مدت تک شاعری کی۔ ان کی شاعری کے شعری مجموعے 'جھنکار'، 'آخرِ شب'، 'آوارہ سجدے' اور 'سرمایہ' ہمارے سامنے موجود ہیں۔ انھوں نے نظمیں اور غزلیں دونوں کہی ہیں لیکن ان کی نظمیں تعداد میں زیادہ ہیں۔ غزلیں انھوں نے بہت کم کہی ہیں۔ ان کی شاعری کا سنجیدہ اور گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں تخلیقی صلاحیت اور ابلاغ بطریقِ احسن تھی۔ ان کی مشہور نظمیں 'اندیشے'، 'ایک بوسہ'، 'زندگی'، 'ایک لمحہ'، 'بہروپنی'، 'عورت اور رام کا ایک اور بن باس' وغیرہ اس امر کا ثبوت ہیں۔ 'اندیشے'، 'شرارہ' اور 'ایک بوسہ' میں تو انھوں نے شعریت کی وہ شمع روشن کی ہے کہ جس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

اداریہ

اترپردیش حکومت کی اردو دشمنی کی ایک اور مثال

مرکزی حکومت کے ۱۹۵۸ء کے Statement on Language میں ان سہولتوں کی فہرست دی گئی ہے جو مرکزی اور صوبائی حکومتیں اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے فراہم کریں گی۔ اس فہرست کے نمبر ۴ میں یہ کہا گیا ہے کہ "تمام عدالتیں اور دفاتر اردو دستاویز قبول کریں گی اور اردو دستاویز کے ساتھ ترجمے یا ان دستاویزات کو کسی اور رسم الخط میں دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ درخواستیں اور نمائندگیاں بھی اردو میں منظور کی جانی چاہئیں"۔ لیکن درخواست تو دور کی بات ہے بلکہ اترپردیش اسمبلی کا اگر کوئی رکن اردو میں حلف لینا چاہتا ہے تو اسے اجازت نہیں دی جاتی۔ اس طرح کے معاملات اترپردیش کی اسمبلی میں کئی بار ہوئے ہیں جس کی بظاہر وجہ صرف یہ ہے کہ اگر اترپردیش حکومت کی کارکردگی کی پوری تفصیل مرتب کی جائے تو ہمیں یقین ہے کہ دنیا کی بدترین صوبائی حکومت ہونے کی وجہ سے وہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہو جائے گی۔ لیکن اپنی اردو دشمن سرگرمیوں میں اس درجہ مستعد ہے کہ اردو مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی اور اس حکومت کے افسران اردو مخالفت کے لیے ایسے ایسے بہانے ڈھونڈتے ہیں جن کی مثالیں ملنی مشکل ہیں۔

حال ہی میں اترپردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر لال بہادر نے امبیڈکر نگر کے اکبرپور اسمبلی حلقے سے اپنا پرچہ نامزدگی اردو میں داخل کیا تھا۔ اردو دشمن بلکہ قوم و ملک دشمن ضلع الیکشن افسر نے یہ پرچہ نامزدگی اس لیے قبول نہیں کیا کیوں کہ یہ پرچہ اردو میں بھرا ہوا تھا۔ عذر یہ تھا کہ ان کے دفتر میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس فارم کا اردو سے ہندی میں ترجمہ کر سکے۔ ہم نے اوپر امبیڈکر نگر (یوپی) کے ضلع الیکشن افسر کو ملک و قوم دشمن کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے مسائل پر تعصب سے کام لیتے ہیں ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ مختلف فرقوں میں اختلافات اور دشمنی پیدا کریں جس کا اثر پورے ملک اور قوم پر ہوتا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو پوٹو کے تحت گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا جانا چاہیے۔ اگر ہندوستان میں جمہوریت کو برقرار رکھنا ہے تو جن صوبوں کے افسران اس طرح کی حرکتیں کریں ان کے وزرائے اعلا پر بھی مقدمہ دائر کرنا چاہیے۔

بہر حال یہ جملہ معترضہ ذرا طویل ہو گیا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اکبرپور اسمبلی حلقے سے اپنا پرچہ نامزدگی اردو میں داخل کرنے والے ڈاکٹر لال بہادر نے ہائی کورٹ میں ایک رٹ پٹیشن داخل کیا ہے جس میں عدالت سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اکبرپور اسمبلی حلقے کے الیکشن کو کالعدم قرار دے۔ ہائی کورٹ نے بہوجن سماج پارٹی کے ممبر اسمبلی رام اچل راج بھر کو نوٹس جاری کر دیا ہے کہ وہ ۱۵ رجولائی تک اس معاملے میں جواب داخل کریں۔

☆☆☆

پندرہ روزہ "ہماری زبان" دہلی کے تین قدیم ترین شمارے

دوسری قسط

محمد خالد عابدی (آل انڈیا ریڈیو جھالاواڑ، راجستھان)

"ہماری زبان" میں مختلف قسم کے اشتہارات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے اور ان اشتہارات کے صفحات شروع میں ہی پہلے صفحے پر ظاہر کر دیے گئے ہیں۔

چہار گوشے میں (ص ۲) کتاب "تاریخ افکار و سیاست اسلامی" کا اشتہار ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کتاب میں پہلی بار مذہب اسلام کی سیاسی اور ذہنی تاریخ کو یکجا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ کتاب کی تقریظ مولانا عبداللہ سندھی، تقریب چودھری غلام احمد پرویز مولف "معارف القرآن" دیباچہ مولانا اسلم جیراجپوری اور مولانا سید ابوالاعلا مودودی ہیں۔ کتاب کی ضخامت ۲۴۰ صفحات کی ہے۔ کتاب کا سائز ۲۶×۲۰ اور قیمت مجلد پانچ روپے ہے۔ کتاب ملنے کا پتا اس طرح درج ہے عبدالوحید خاں بی اے ایل ایل بی، ۹۔ لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

صفحہ ۸ پر آغا محمد اشرف ایم۔ اے دہلوی کی کتاب "ہوائی حملے" کا اشتہار شائع ہوا۔ مرتب کتاب سینئر انائونسر ہندوستانی سیکشن بی بی سی لندن رہے ہیں۔ انھوں نے بمباری کے نقصانات اور ان سے کس طرح تحفظ ممکن ہے نیز لندن پر جو بمباری ہوئی تھی اس کے حالات بھی کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔ کتاب کی قیمت دس آنے علاوہ محصول ڈاک تھی۔ کتاب کا ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر جامع مسجد دہلی ہے۔

"حقیقت جاپان" ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر کی کتاب ہے۔ کتاب میں انھوں نے جاپان کی تہذیب و ثقافت اور افواج و قوانین کی معلومات دی گئی ہیں۔ کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے"۔ کتاب میں کئی تصاویر شامل ہیں اور تین روپے آٹھ آنے میں یک ڈپو انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی سے حاصل کی جا سکتی تھی۔

دانش محل لکھنؤ ایک اچھا پبلشنگ ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی کتاب کی فراہمی کا بہترین مرکز ہے۔ دانش محل کا ماضی، حال کی طرح کامیاب رہا ہے۔ اشتہار میں کہا بھی گیا ہے کہ "اردو کے مرکز لکھنؤ میں اردو کا بہترین کتب خانہ" اور پھر تفصیل میں ہے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی جملہ مطبوعات لاہور، دہلی اور حیدرآباد کے مصنفین اور آزاد، حالی، شبلی، غالب، داغ، اکبر، اصغر، جوش اور علامہ اقبال کی قدیم و جدید کتب حاصل کرنے کے لیے کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ کا پتا دیا گیا ہے۔ آج بھی یہ ادارہ اسی پتے پر قائم و فعال ہے۔

ادویات کے اشتہارات بھی ہیں۔ ڈاکٹر بسیم سین کی تیار کردہ "ہسٹریا سائیڈ" نام سے دوا تھی، اس دوا کے استعمال کی سفارش حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے دفتر اخبار منادی دہلی کے توسط سے بھی کی تھی۔ دوسرا اشتہار "نگینوں کا کشتہ" ہے۔ اس کے اشتہار میں کہا گیا ہے کہ اس کشتے کو مریض و تندرست، عورت، مرد اور بچے کسی، بھی موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ کشتہ ہاضم طعام، مقوی گردہ، مقوی دماغ اور درد کمر کے لیے مفید بتایا گیا ہے۔ اشتہار کی پہلی سطر ہی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے کہ "یہ وہ کشتہ ہے جو آخری بادشاہ ابو ظفر بہادر شاہ کے وزیر اعظم اور طبیب خاص حکیم احسن اللہ خاں کے خاندان کے ایک ممتاز فرد نے ہمیں تیار کر کے دیا ہے"۔

'ہماری زبان' کے صفحہ آخر (۱۲) پر نصف آخر میں بیمہ کمپنی کا اشتہار ہے۔ اس بیمہ کمپنی کے سرپرستوں میں ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال اور ہز ہائینس آغا خاں صاحب کے اسمائے گرامی ہیں۔ بیمہ کمپنی کا صدر دفتر ۹۔ کلائیو اسٹریٹ، کلکتہ میں تھا۔ یہ بیمہ کمپنی دی ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ کے نام سے تھی۔ مذکورہ بیمہ کمپنی کے نمائندے ملک اور بیرون ملک میں تھے۔ لندن، بمبئی، لاہور، حیدرآباد (دکن)، احمد آباد میں اس کی شاخیں قائم تھیں۔ بیمہ کمپنی نے اپنے سرمائے کی حالیہ کیفیت عوام پر ظاہر کی تھی، جیسے

مجوزہ سرمایہ	ساٹھ لاکھ روپے
جاری شدہ سرمایہ	بائیس لاکھ چوالیس ہزار ساٹھ روپے
ادا شدہ سرمایہ	گیارہ لاکھ چھتے ہزار پانچ سو روپے

پیش نظر ہماری زبان دہلی (۱۹ دسمبر ۱۹۴۲ء) کا شمارہ حکیم ہادی احمد نے جید برقی پریس بلی ماران دہلی میں چھپا اور سید صلاح الدین ہاشمی نے نمبرا دریا گنج، دہلی سے شائع کیا تھا۔ اڈیٹر تھے کیفی دہلوی۔

پندرہ روزہ "ہماری زبان" دہلی کے ۱۹ر دسمبر ۱۹۴۲ء (نمبر ۱۸، جلد ۳) کے تفصیلی تعارف کے بعد اس سلسلے کا دوسرا شمارہ پہلی اکتوبر ۱۹۴۳ء (نمبر ۱۳، جلد ۵) کا پیش نظر ہے۔ اس شمارے کا تعارف اس طرح ہے کہ "افکار و واقعات" کی شہ سرخی کے تحت درج ذیل عنوانات پر بحث و تفصیل ہے

۱۔ "معارف" علی گڑھ کی تائید میں
۲۔ کام کرنے میں لڑائی کیسی؟
۳۔ یو۔ پی پیغام
۴۔ اردو مرکز پر جمع ہو
۵۔ اردو پارک مدھیان
۶۔ پنجاب کے ایک مدرسے کا عجیب رویہ
۷۔ اردو یونیورسٹی ایجنسی
۸۔ اردو کا ٹیٹ دہلی

۱۔ "معارف۔ علی گڑھ کی تائید میں: مولوی عبدالحق صاحب نے (فروری ۱۹۴۳ء) علی گڑھ میں منعقد اردو کانفرنس میں خطبہ صدارت پیش کیا تھا۔ اس خطبے پر مولانا سید سلیمان ندوی نے ستمبر ۱۹۴۳ء کے معارف میں ایک مختصر شذرہ فرمایا تھا۔ چنانچہ "ہماری زبان" نے اپنا نظریہ اس طرح پیش کیا تھا:

"ہم مولانا کے اس خیال سے اختلاف کرنا کچھ ضروری نہیں سمجھتے کہ مسلم یونیورسٹی میں اردو کا معیار دوسری یونیورسٹیوں سے بہتر ہے اور وہاں اردو کی تعلیم کا نظم و نسق دوسری درس گاہوں کے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دنیا

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام

میرٹھ (ڈاک سے) اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے شعبۂ اردو کے قیام کی کوششیں جاری تھیں۔ لیکن موجودہ وائس چانسلر پروفیسر رمیش چندرا کی کوششوں اور لگن اور اتر پردیش کے گورنر جناب وشنو کانت شاستری کے تعاون سے شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا تقرر ہوا۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اپنا چارج سنبھال لیا ہے اور شعبے میں کام کاج شروع ہو گیا ہے۔ اس سال سے ایم۔ اے (اردو) کی کلاسیں شروع ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اس سے قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں بطور لکچرر خدمات انجام دے رہے تھے۔

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی جسے میرٹھ یونیورسٹی بھی کہا جاتا ہے، کا قیام ۱۹۶۵ء میں عمل میں آیا۔ اس کے تحت غازی آباد، مظفر نگر، بلند شہر اور میرٹھ میں کئی کالجوں میں اردو کی تعلیم و تدریس ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح تک جاری ہے لیکن میرٹھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی کمی شدت سے محسوس کی جاری تھی۔ پروفیسر رمیش چندرا جنہیں میرٹھ یونیورسٹی کا مسیحا کہا جاتا ہے، نے اپنی ذاتی لگن اور کاوشوں سے شعبۂ اردو کے قیام کو عملی جامہ پہنایا۔

(پریس ریلیز شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

ضلع نلگنڈہ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ

نلگنڈہ۔ انجمن ترقی اردو ضلع نلگنڈہ کے سکریٹری جناب خواجہ فریدالدین نے اپنے ایک صحافتی بیان میں بتایا کہ ضلع نلگنڈہ کی ۳۵ فیصد آبادی کی مادری زبان اردو ہے جب کہ ضلع کے بڑے تعلقہ جات بھونگیر، رامنا پیٹ، سوریا پیٹ، حضور نگر، مریال گوڑہ اور دیورکنڈہ کے چالیس فیصد عوام کی مادری زبان اردو ہے۔ حکومت آندھرا پردیش ریاست میں مختلف زبانوں اور تہذیب کی ترقی کے سلسلے میں موثر اقدامات کر رہی ہے جس کے نتیجے میں ریاست کے تیرہ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا، لیکن ضلع نلگنڈہ میں اردو زبان سے واقفیت رکھنے اور اردو کو بحیثیت مادری زبان استعمال کرنے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد ہونے کے باوجود اس ضلع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہ دیا جانا باعث صد افسوس ہے۔

(سیاست۔ حیدر آباد)

اردو پرائمری اسکول کو اپر پرائمری اسکول کا درجہ

نارائن پیٹ۔ نارائن پیٹ ڈویژن میں منڈل دامرگدہ کے موضع میں ۱۹۸۰ء میں اردو پرائمری اسکول کا آغاز عمل میں آیا تھا۔ ۲۰۰۱ء میں مہتمم تعلیمات ضلع محبوب نگر نے مدرسے کے درجہ کو بڑھا کر اپر پرائمری اسکول بنایا مگر تین سال کے عرصے میں ایک بھی اردو مدرس کی اسامی منظور نہیں ہوئی۔ سات جماعتوں میں جملہ دو سو طلبہ و طالبات موجود ہیں جب کہ تعلیم کے لیے ایک بھی اردو مدرس کی اسامی منظوری عمل میں نہیں لائی گئی۔ جناب جلال حسین نے کہا کہ دامرگدہ اپر پرائمری اسکول میں اردو اساتذہ کی اسامیوں کی منظوری کے لیے چیف منسٹر جناب این چندرا بابو نائیڈو اور ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن کو مکتوب روانہ کیے گئے ہیں۔

(رہنمائے دکن۔ حیدر آباد)

تیل جھالا اردو اسکول کی تعمیر کا کام شروع

کلکتہ۔ شہر کلکتہ کے تیل جھالا اردو ہائی اسکول (جلاڈ نس پارک) کی عمارت کی تعمیر کا کام شروع کرنے کی اجازت دینے پر کونسلر اقبال احمد کی قیادت میں ایک وفد نے میئر سبرتو مکھرجی سے اظہار تشکر ادا کیا۔ وفد میں کونسلر منظر اقبال، حافظ شمس الحق فہمی، محمد عبداللہ اور محمد حمید شامل تھے۔ میئر سبرتو مکھرجی نے اس الزام کو غلط بتایا کہ ترنمول کانگریس کے بورڈ کارپوریشن میں آنے پر اسکول کی تعمیر کا کام روک دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکول کے کاغذات کی جانچ کے بعد نقشہ درست پایا گیا اور تعمیر کی اجازت دے دی گئی۔ میئر نے تیل جھالا مسلم ہائی اسکول کی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں بھی تعاون دینے کا وعدہ کیا اور کسی دن دونوں اسکولوں کے کاغذات لے کر آنے کا مشورہ دیا ہے۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

ضلع میدک کے سرکاری دفاتر پر اردو سائن بورڈ نظر انداز

سنگاریڈی۔ ضلع میدک وقف کمیٹی کے ڈائرکٹر جناب محمد خواجہ نے ضلع میدک میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے باوجود ضلع میدک کے ہیڈ کوارٹر سنگاریڈی میں سرکاری دفاتر پر اردو سائن بورڈز تحریر نہ کرنے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ محکمہ جات حکومت کے احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو زبان کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ جناب محمد خواجہ نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں ضلع کلکٹر میدک کے علاوہ آر ڈی او، ڈسٹرکٹ منیجر سے ملاقات کر کے ایک یادداشت پیش کریں گے۔

(سیاست۔ حیدر آباد)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کو مجلس فروغ اردو ادب قطر کا ادبی ایوارڈ

دوحہ قطر (ڈاک سے) سال رواں مجلس فروغ اردو ادب ایوارڈ کے لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا انتخاب کیا گیا۔ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے جو ہر سال دوحہ قطر کی ایک شاندار تقریب میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ایوارڈ ہندوستان میں آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، کالی داس گپتا رضا اور پاکستان میں احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور بانو قدسیہ کو پیش کیا جا چکا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام کا اعلان پینل آف جج نے کیا جس کے چیئرمین پروفیسر شہریار اور اراکین جناب براج کومل، پروفیسر صادق اور پروفیسر صغریٰ مہدی تھے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنی وسیع ادبی و علمی خدمات کے لیے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ پچاس سے زیادہ علمی کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں جن میں چالیس سے زائد اردو میں، سات انگریزی میں اور تین ہندی میں ہیں۔ تحقیق، تنقید اور لسانیات تینوں میں وہ پایۂ امتیاز رکھتے ہیں۔ انھیں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے 'پدم شری' اور صدر پاکستان کی جانب سے طلائی تمغۂ امتیاز عطا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد علمی و ادبی اداروں نے انھیں اعزازات اور ایوارڈ دیے ہیں۔ وہ امریکہ کی وسکانسن یونیورسٹی، ناروے کی اوسلو یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر اور اگی میں راک فیلر فیلو رہے ہیں۔ ہندوستان میں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ ان دنوں وہ ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو کے وائس چیئرمین ہیں۔

پاکستان میں یہ ایوارڈ اس سال شوکت صدیقی کو دیا گیا۔ جیوری کے چیئرمین جناب مشتاق احمد یوسفی تھے۔

(پریس ریلیز مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر)

محمد منظور احمد اور عظیم الدین عظیم کی مرتبہ کتاب "ڈاکٹر محمد طیب انصاری۔ شخص اور عکس" کی رسم رونمائی

بنگلور (ڈاک سے) ڈاکٹر محمد طیب انصاری کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق مضامین کا مجموعہ "ڈاکٹر محمد طیب انصاری۔ شخص اور عکس" جسے محمد منظور احمد اور عظیم الدین عظیم نے مرتب کر کے مجلس ادب، بنگلور کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔ اس کی رسم اجرا ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء کو شام ساڑھے چار بجے دارالسلام کوئنس روڈ (بنگلور) میں استاد الاساتذہ میجر خلیل الرحمٰن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ جناب محمد منظور احمد (صدر مجلس ادب) نے صدارت کی جب کہ پروفیسر ابو تراب خطائی، جناب سید احمد ایثار اور جناب سلیم تمنائی نے طیب انصاری کی شخصیت اور کارناموں پر اظہار خیال کیا۔ جناب عظیم الدین عظیم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ رسم اجرا کی تقریب کے بعد مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس کی صدارت حضرت آزاد ساحری نے کی۔ جناب ریاض احمد خمار نے مشاعرے کی کارروائی چلائی اور عظیم الدین عظیم نے شکریہ ادا کیا۔

انجمن ترقی اردو کانپور کی صہبا لکھنوی اور والی آسی کو خراج عقیدت

کانپور (ڈاک سے) انجمن ترقی اردو کانپور کے ایک تعزیتی جلسے میں جو نامی انصاری صاحب کے مکان پر انہی کے زیر صدارت منعقد ہوا، صہبا لکھنوی اور والی آسی کی رحلت پر اظہار افسوس کیا گیا اور ان کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

جلسے میں ایک متفقہ قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ صہبا لکھنوی نے مسلسل ۵۷ سال تک موقر ادبی ماہنامہ "افکار" (کراچی) جاری رکھا اور اس میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا۔ انھوں نے متعدد ادبی شخصیات پر ضخیم اور دستاویزی خاص نمبر شائع کیے جو ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

والی آسی ایک خوش فکر اور پختہ کار شاعر تھے۔ ان کا ذہن جدید تھا اور وہ عصر حاضر کے نازک مسائل کو بڑی خوبی سے اپنی غزلوں میں سمو لیتے تھے۔ شخصی طور پر بھی وہ نہایت نفیس اور اعلا اخلاق کے انسان تھے۔ آخر میں دونوں مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

شرکائے جلسہ میں عشرت ظفر، حیدر جعفری سید، تسکین زیدی، یوسف علوی، حکیم حبیب الرحمٰن، جمیل اختر نعمانی، شاہد اختر، ظفر غازی، دلشاد لاری اور عابد نظر خاص کر قابل ذکر ہیں۔

(پریس ریلیز انجمن ترقی اردو کانپور)

بھینسہ میں معیاری اردو میڈیم اسکول کا قیام

بھینسہ۔ بھینسہ میں معیاری اردو میڈیم اسکول کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے محلہ بنگالہ گلی بھینسہ ضلع عادل آباد میں اول تا ہفتم نوبل اسکول کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ نوبل اسکول کا بنیادی مشن معیاری اقدار پر مبنی تعلیم کی فراہمی ہے۔ تعلیمی نصاب حکومت آندھرا پردیش کا مسلمہ ہے عصری و اسلامی تعلیم کی فراہمی کے ساتھ ساتھ سائنس لیباریٹری، لائبریری، بہتر انفراسٹرکچر، صحت افزا ماحول، بہتر تدریسی آلات اور چھوٹی جماعتوں کے لیے کھلونوں وغیرہ کا نظم ہے۔ علاوہ ازیں ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا ہے جو اسکول کی تعلیمی صورت حال پر نگرانی رکھے گا۔

(سیاست۔ حیدر آباد)

گرامی نامے

ادارے کا ہر اسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پروفیسر آل احمد سرور نمبر

مکرمی! "ہماری زبان" کا آل احمد سرور نمبر مل گیا ہے۔ سب مضامین بہت معیاری ہیں اور سرور صاحب کی زندگی اور کارناموں کے تمام گوشوں کو منور کرتے ہیں۔ البتہ سرور صاحب کے سنہ پیدائش کا تعین آج تک نہیں ہو سکا کوئی ۱۹۱۱ء لکھتا ہے، کوئی ۱۹۱۲ء لکھتا ہے۔ دہلی کے ایک ادبی رسالے میں تو دونوں سنین ایک ہی شمارے میں الگ الگ لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے تعین کے لیے کوئی حتمی شہادت درکار ہے۔ سرور صاحب نے اگر خود اپنا سنہ پیدائش ۱۹۱۱ء لکھا ہے تو اس کے لیے بھی کوئی بیرونی شہادت کا درکار ہے۔ مصنف کے اپنے بیان میں کوئی مصلحت بھی ہو سکتی ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

(نامی انصاری۔ کانپور)

انجمن ترقی اردو ویشالی
کے زیر اہتمام

تحریری و تقریری مقابلے

حاجی پور (ڈاک سے) انجمن ترقی اردو ویشالی کے زیر اہتمام گزشتہ ۱۲ مئی کو میٹرک اور انٹرمیڈیٹ درجے کے طلبہ وطالبات کے درمیان تحریری و تقریری مقابلے کا انعقاد بمقام انجمن فلاح المسلمین حاجی پور کے وسیع ہال میں اختتام پذیر ہوا۔ مقابلے میں اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو مولانا شکیل احمد قاسمی (پٹنہ) کے ہاتھوں "سید فصیح الدین احمد ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ اس موقع پر مولانا قاسمی نے کہا کہ آج جب پوری دنیا حسن کا مقابلہ منعقد کر رہی ہے ایسے وقت میں انجمن ترقی اردو ویشالی نے طلبہ کے اندر علم کا ذوق پیدا کرنے کے لیے تحریری و تقریری مقابلہ منعقد کرا کے قابل تحسین اور قابل تقلید کام کیا ہے۔ مہمان خصوصی مجسٹریٹ عبدالشان نے کہا کہ انجمن نے تحریری و تقریری انعامی مقابلے کا انعقاد کر کے ملت کے نونہالوں کے دل پر ایک نقش قائم کیا ہے اور یہ نقش ان طلبہ کے لیے یقیناً مشعل راہ کا کام کرے گا۔

جلسے کے صدر مولانا امین احمد خاں نوری چترویدی نے کہا کہ انجمن ترقی اردو ویشالی کو ایسا قابل تحسین کام آگے بھی جاری رکھنا چاہیے۔ انھوں نے نئی نسل کو اسلامیات سے بھی دلچسپی پیدا کرانے کی ضرورت پر زور دیا۔ جلسہ کو ضلع راشٹریہ جنتادل کے جنرل صدر الحاج محمد حنیف، اصلاح ملت کمیٹی کے جنرل سکریٹری محمد عظیم الدین انصاری اور جمعیت شباب اسلام بہار کے جنرل سکریٹری مفتی شاہ الہدیٰ قاسمی نے بھی خطاب کیا۔ اس موقع پر مقابلے میں کامیاب ہونے والے طلبہ مناظر حسن آزاد، مظاہر حسن اقبال، لطیف احمد خاں، محمد نعمت آزاد، نیر اعظم، حسن احمد اور غلام سرور کو کتابوں اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔

(انوار الحسن وسطوی)

انجمن فروغ اردو جموں وکشمیر کا کیفی اعظمی کو خراج عقیدت

انجمن فروغ اردو جموں وکشمیر نے ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء کو منعقدہ اپنی ادبی نشست میں جس کی صدارت انجمن کے صدر جناب مالک رام آنند نے فرمائی۔ اس بات پر گہرے دکھ اور غم کا اظہار کیا کہ اردو کے مشہور اور نامور شاعر جناب کیفی اعظمی کا ۱۰ مئی ۲۰۰۲ء کو ممبئی میں انتقال ہو گیا۔ ممبران انجمن نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ترقی پسند ادب کے ایک اہم رکن اور ستون تھے۔ ان کو شروع سے ہی ایسے لوگوں کو دیکھ کر بہت افسوس اور دکھ ہوتا تھا جو چپ چاپ ظلم وستم اور دوسروں کی زیادتیوں کو سر خم کر کے برداشت کرتے تھے۔ کیفی کی انقلابی شاعری نے ایسے لوگوں کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی اور انھیں جینے کا اور زمانے کے نشیب وفراز سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بخشا۔

انجمن کو یہ احساس ہے کہ کیفی اعظمی کی وفات کے ساتھ جہاں ترقی پسند ادب کا ایک درخشندہ ستارہ روپوش ہو گیا ہے وہیں اردو شاعری کا سورج بھی گہن میں آ گیا ہے۔ اردو ادب کو ان کے جانے سے ایسا نقصان ہوا ہے جسے پورا نہیں کیا جا سکتا۔

(پریس ریلیز انجمن فروغ اردو جموں وکشمیر)

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے تعلیمی وظیفے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے تعلیمی سال کے لیے قرض وظیفے جاری کرنے کے واسطے درخواستیں طلب کرتی ہے۔

صرف وہی مسلم طلبہ وطالبات درخواست بھیجنے کے مجاز ہوں گے جنھوں نے دسواں درجہ (میٹرک) کم از کم ۸۰ فیصد یا بارہواں (انٹر) یا اس کا مساوی امتحان ۷۵ فیصد یا گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کم از کم ۷۰ فیصد نمبروں سے پاس کیا ہو، جن طالب علموں کے نمبر اپنی اپنی ریاستوں میں درخواست دینے والے طلبہ میں سب سے زیادہ پائے جائیں گے صرف ان ہی طلبہ وطالبات کو اکتوبر ۲۰۰۲ء میں کسی وقت سوسائٹی کے خرچ پر دہلی بلایا جائے گا۔ دہلی میں دو دن قیام کے دوران ان کا انگریزی اور معلومات عامہ (جنرل نالج) میں امتحان اور انٹرویو لیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی وظیفوں کا فیصلہ ہوگا۔ وظیفہ میٹرک پاس کو ۲۵۰ روپے، انٹر پاس کو ۳۵۰ روپے، گریجویٹ کو ۵۰۰ روپے اور پوسٹ گریجویٹ کو (ریسرچ کے لیے) ۱۲۰۰ روپے ماہانہ دیا جائے گا۔ جو طلبہ وطالبات وظیفے کے حقدار ٹھہریں گے ان کو ایک بانڈ بھر کر دینا ہوگا کہ تعلیم مکمل کر لینے کے زیادہ سے زیادہ دو سال کے بعد سے قرض وظیفہ کی رقم ماہ بہ ماہ (اگر چاہیں تو ایک مشت بھی) ان ہی قسطوں میں واپس کرنا شروع کر دیں گے، جن قسطوں میں وہ ان کو ملی تھی۔ وظیفہ پانے والے طلبہ کی تعلیمی پیش رفت کا ہر سال احتساب ہوگا اور اگر رفتار اطمینان بخش پائی تو وظیفے کی تجدید کی جائے گی۔ وظیفہ کا فیصلہ کرتے وقت صلاحیت اور مالی حالت دونوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ ان امیدواروں کو جن کی مالی حالت اطمینان بخش ہے وظیفے کے بجائے بک گرانٹ یا کتابیں خریدنے کے لیے عطیہ دیا جائے گا۔

اس اسکیم کے تحت ۱۹۸۶ء سے اب تک ۲۵۸ مسلم طلبہ وطالبات فیض یاب ہو چکے ہیں، جو ملک کی مختلف ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ غیر ملکی طلبہ کو یہ وظیفہ نہیں دیا جاتا ہے۔ وظیفہ کی اسکیم سوسائٹی کے سابق صدر مرحوم حکیم عبدالحمید صاحب کی ایما پر (موجودہ صدر، جناب عبدالمعید) اس لیے جاری کی گئی تھی کہ ہندوستانی مسلمان جو تعلیم میں پیچھے ہیں، انھیں تعلیمی میدان میں آگے لایا جائے اور ان میں مقابلے کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ تعلیمی پس ماندگی سے نکل کر ملک کی ترقی میں زیادہ موثر کردار ادا کر سکیں۔

جو مسلم طلبہ یہ وظائف پانے کے خواہش مند ہیں اور جن کا ارادہ ہے کہ وہ تعلیم کا سلسلہ عصری تعلیم کے کسی تسلیم شدہ ادارے میں کم از کم ۲۰۰۲-۰۳ء کے تعلیمی سال تک جاری رکھیں گے وہ سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد سنگم وہار، نئی دہلی پن کوڈ ۱۱۰۰۶۲ کے نام خط بھیج کر درخواست فارم منگوا سکتے ہیں۔ بھرے ہوئے فارم ۱۰ ستمبر ۲۰۰۲ء تک وصول کیے جائیں گے۔ تاخیر سے آنے والی درخواستوں پر غور ممکن نہ ہوگا۔

(پریس ریلیز ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نئی دہلی)

سیکولر روایات ہی اس ملک کی بقا کی ضمانت ہیں - کلدیپ نیر

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر کے موقع پر معروف صحافی اور راجیہ سبھا ممبر جناب کلدیپ نیر نے "کیا ہندوستان میں سیکولرازم باقی رہے گا" کے موضوع پر اپنی گفتگو میں گاندھی جی کے سیکولر کردار کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ گاندھی جی ہمیشہ سیکولرازم کے علمبردار رہے، وہ برابر ہندو مسلم اتحاد کی وکالت کرتے رہے اور ان کا تاریخی بیان بھی ہمارے سامنے ہے جس میں انھوں نے ہندو اور مسلمان کو ہندوستان کی دو آنکھیں کہا مگر افسوس کہ اسی گاندھی کی سرزمین پر گجرات سانحے کے بعد سیکولرازم کے اوپر ایک سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر اطمینان ظاہر کیا کہ مستقبل میں ہندوستان میں سیکولر روایات کا تحفظ ممکن ہے کیوں کہ ہندوستان کی اکثریت سیکولر ہے۔ جناب کلدیپ نیر نے اپنی تقریر میں سیکولرازم کی بھی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سیکولرازم کا مطلب لادینیت ہے جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ سیکولرازم کا مطلب مذہبی آزادی ہے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں شیخ عبداللہ کے بھی سیکولر نظریے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب شیخ عبداللہ سے یہ پوچھا گیا کہ آپ پاکستان کیوں نہیں جانا چاہتے ہیں تو انھوں نے فرمایا تھا کہ میں اس ملک میں رہنا نہیں چاہتا ہوں جس میں صرف ایک مذہب کے لوگ رہتے ہوں بلکہ میں ایک ایسے ملک میں رہنا چاہتا ہوں جس میں تمام مذہب وملت کے لوگ رہتے ہوں۔ اپنی تقریر کے اختتام پر کلدیپ نیر نے کہا کہ سیکولر روایات ہی ہماری اتحاد کی علامت ہیں کیوں کہ بغیر سیکولر روایات کے اس ملک کی بقا ممکن نہیں ہے۔

جناب کلدیپ نیر کی تقریر سے پہلے جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ فخرالدین علی احمد لیکچر غالب انسٹی ٹیوٹ کی اہم سرگرمیوں میں سے ہے۔ ہندوستان کے اہم دانشور وادیب نے اس موقع پر اپنے خطبات پیش فرمائے ہیں۔ آج کا دن ہمارے لیے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ آج جناب کلدیپ نیر نے اس اہم موضوع پر تقریر کرنے کے لیے ہماری درخواست قبول کی۔

اس موقع پر پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے جناب کلدیپ نیر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ نیر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے سیکولرازم کی حمایت میں آواز اٹھائی ہے۔

جناب سید مظفر حسین برنی نے جناب کلدیپ نیر اور چند سیکولر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جب تک اس طرح کی شخصیتیں ہندوستان میں موجود ہیں یہاں کی سیکولر روایات کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس موقع پر جناب حسن امام دہوی نے مرحوم فخرالدین علی احمد کی شان میں چند اشعار پیش کیے۔

(پریس ریلیز غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی)

جونیئر گرلز کالج جگتیال میں اردو میڈیم طالبات کے مسائل

جگتیال۔ جگتیال جونیئر کالج گرلز میں اردو میڈیم کے طالبات کے لیے ایم پی سی نہ ہونے کی وجہ سے طالبات کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایم پی سی کی طالبات کو کہیں اور جا کر کورس کی تکمیل کرنی پڑتی ہے۔ اس کالج میں صرف بی پی سی کورس ہے، اگر حکومت کی جانب سے صرف Maths کے لکچرر کا تقرر ہو جائے تو طالبات ایم پی سی میں داخلہ لے سکتی ہیں۔ ڈاکٹر یوسف ساجد جنرل سکریٹری بزم اردو ادب جگتیال نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ اس مسئلے پر توجہ دے اور کالج میں دو کیشنل کورس کے لیے بھی انتظام کرے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : انیسواں ادھیائے
مصنف : نند کشور وکرم
ضخامت : ۲۰۸ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، بے-۶، کرشن نگر دہلی-۵۱
تبصرہ نگار : پریم پال اشک

نند کشور وکرم کا شمار اردو کے مستند قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار صحافی بھی ہیں اور عمدہ افسانہ نگار اور ناول نویس بھی۔ انھوں نے اردو دنیا میں 'عالمی اردو ادب' کے نام سے ایک حوالہ جاتی صحیفے کی اشاعت سے اپنی شناخت پیدا کی ہے۔ وہ پچھلے پندرہ سال سے نہایت لگن کے ساتھ یہ بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے افسانوی مجموعہ "آوارہ گرد" اور ناول "یادوں کے کھنڈر" جیسا صحت مند ادب بھی اردو ادب کو دیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہندی میں اردو کے مستند ادیبوں کی متعدد کتب کے تراجم اور ترتیب و تدوین کا کام بھی انجام دے چکے ہیں۔

"انیسواں ادھیائے" نند کشور وکرم کی تازہ ترین تخلیق ہے جسے ایک تجرباتی ناول کہا جاسکتا ہے، جس میں زندگی اور موت کا تجزیہ نہایت صحت مند انداز میں کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ فلسفہ حیات و موت کیا ہے اور مکر و فریب کے شیشے کو کیسے پاش پاش کیا جاسکتا ہے۔

یہ ناول کئی خوبیوں کا حامل ہے۔ اس میں روایتی ناول جیسا نہ تو کوئی پلاٹ ہے اور نہ ہی کردار۔ فقط مصنف کی روح ہی اس ناول میں جاگزیں نظر آتی ہے۔ فلسفہ حیات و موت، اعلا سماجی اقدار اور ہر طرف نظر آنے والی توہمات، بغض و ریا، مکر و فریب، تشدد، نفرت، ظلم و استبداد کا دور دورہ اس ناول کے تجزیدی کردار ہیں اور اس کے مطالعے سے صحت مند سماجی اور اخلاقی اقدار کو صحیح معنی میں تقویت ملتی ہے اور حیات و موت کی گتھی کو سلجھانے کی بھی کافی حد تک کوشش کی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف نے ناول نگاری کے روایتی انداز سے سراسر بغاوت کی ہے۔ پورا ناول مصنف کی اپنی ذات کے ارد گرد گھومتا محسوس ہوتا ہے۔ فلیش بیک ہوتے ہوئے بھی فلیش بیک محسوس نہیں ہوتا۔ ان کے بچپن کے واقعات سیاسی، سماجی اور قومی تحریکات اور ۱۹۴۷ء کا خونچکاں دور یہ سب کچھ ذہن کے پردے پر فلم کی ریل کی طرح رقصاں نظر آتا ہے۔

نند کشور وکرم نے اپنے خوش فکر انداز کے ذریعے پورے ناول کا خمیر اٹھایا ہے۔ اسلوب بیان اتنا دلکش ہے کہ پورا ناول ایک نشست میں ہی آنکھ جھپکتے ہی ختم ہو جاتا ہے اور پھر اسے دوبارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ اس ناول کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس ناول کا دیباچہ بھی پڑھنے کے لائق ہے جس میں مہابھارت کے حوالے سے حیات و موت کا فلسفہ پیش کیا گیا ہے اور یہی اس ناول کا حقیقی موڑ اور عروج ہے۔ یہ ناول صحیح معنی میں ترقی پسند ادب کی ترجمانی کرتا ہے اور صحت مند ادب کی تقویت کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

اس کے علاوہ اس ناول کا ترجمہ ملک کی دوسری علاقائی زبانوں میں کیا جانا چاہیے تاکہ دوسری زبانوں کے قارئین بھی اس اچھوتے ناول سے حظ اٹھا کر مستفیض ہوسکیں۔

☆☆☆

نام کتاب : پروفیسر طلیبر ورما اختر
احوال و شاعری
مولف : بجے گوڑ بولے
ضخامت : ۱۸۸ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : اسہاق پبلی کیشنز، پونہ
تبصرہ نگار : رام پرکاش راہی

زیر نظر کتاب اپنی نوعیت کی الگ جھلک واحد تصنیف ہے جس کی اشاعت کا سہرہ مولف کے سر جاتا ہے۔ اس نے ایک اردو اور فارسی کے پنجابی ادیب جیسے غیر معروف دانشور کا حق بجانب نام دیا گیا ہے کو منظر عام پر لانے کی بڑی سنجیدگی کے ساتھ کامیاب کوشش کی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ مولف ایک مراٹھی نژاد اردو ادیب ہے اور پروفیسر ورما اور اس کی وابستگی اپنی خلوص کی دین ہے جو بجے اور پونہ میں ان کے سیل جول سے مرتب ہوئی ہیں۔

کتاب کی ترتیب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ اور اسی نوعیت کی دیگر مشاہیر اردو کی عالمانہ تحریریں ایک ایسے حصے کی ذمہ دار بن گئی ہیں جو پروفیسر ورما کی سوانح، تعلیم و تربیت اور دیگر امور پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں لاہور کی تاریخ اور علمی و ادبی ماہیت بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔

دوسرے دو حصے باب نظم اور باب غزل کہلاتے ہیں اور پروفیسر طلیبر ورما یعنی اختر نابھوی کے کلام کے آئینہ دار ہیں۔ ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی کے توسط سے سلسلۂ تلمیذ ذوق دہلوی تک ثابت کر دیا گیا ہے جو ایک حقیقت ہے اور اختر کے کلام میں فصاحت اور بلاغت کی غیر معمولی کارفرمائی سے واضح ہو جاتی ہے۔ نظم "عشق مجازی و حقیقی" کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

رات دن خانۂ دل میں جو میرے رہتا ہے
ایک دن خانۂ نظروں میں بھی مہماں ہو جائے
میرے گھر بے ہوا ہی کی سیاہی کا سماں
اس کے رخسار کے انوار سے تاباں ہو جائے
کاش پھٹ جائیں گھٹائیں غم فرقت کی مرے
زلف کے ابر سے مہ رو جو فروزاں ہو جائے

وہ جو آجائے تو سمجھوں کا خدا آیا ہے
وہ جو مل جائے تو جانوں کا خدا پایا ہے

وادی گلزار۔ مثال کی نظم میں فطرت کی منظر نگاری کا نمونہ دیکھیے۔

چپہ چپہ پہ جھلکتی ہیں یہاں رعنائیاں
اجلی اجلی چوٹیوں پر حسنِ فطرت کا نکھار
وادی گلزار سراسر حسن کا عالم ہے تو
تیرے آگے ہیچ ہے مجھ کو دو عالم کی بہار
میرے دل میں بس گئی ہے دیوتاؤں کی زمیں
تیرے ہر ہر شے کی الفت تیرے ہر ذرے کا پیار

مستند اور منفرد روایات میں رچی بسی اختر نابھوی کی غزلیات کے چند اچھوتے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان میں تغزل اور شعریت کروٹیں لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

ہر ہر نفس میں اس کی یاد اس کا خیال اس کی ہی فکر
خوابوں میں مجھ سے ہم نفس میرا انیس و ہم نشیں

اک ساغر شراب ہے دنیائے رنگ و بو
یا حسن ہے نقاب ہے رنگیں نقاب میں

مجھ کو ہے اک گھڑی خلوت کی حسرت اور تم
جان اختر اک بھری محفل میں شرماتے ہو کیوں

کتاب بڑے اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ ایک دستاویزی اہمیت رکھتے ہوئے کے ناتے قیمت کا عنصر ارباب ذوق کو بھاری نہیں پڑے گا۔ مولف اور ناشر دونوں اس کارِ خیر کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

بقیہ صفحہ ۲ سے آگے

کیفی صاحب نے اپنی زندگی میں بے شمار مشاعرے لوٹے تھے، وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے لیکن ان کے پڑھنے کا انداز چونکہ پر جلال رعب دار اور ڈرامائی انداز کا ہوا کرتا تھا اس لیے مشاعرے کے سامعین ان کی زبان سے ان کی نظمیں سن کر لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے۔ کیفی صاحب کی دو اور مطبوعات "میری آواز سنو" (فلمی نغمے) اور "ابلیس کی مجلس شوریٰ" (دوسرا اجلاس) بھی ہیں، ان کو پڑھ کر بھی ان کے زرخیز ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔

کیفی صاحب کی شخصیت کا دوسرا اہم رخ فلمی صنعت سے وابستہ تھا۔ وہ ایک نغمہ نگار کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں داخل ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے معاصر نغمہ نگاروں مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی اور جاں نثار اختر وغیرہ کے ساتھ مل کر ہندوستانی فلموں کو ایسے گیتوں سے نوازا کہ جنھیں سن کر دل و دماغ مسحور ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہماری ہندوستانی فلموں کے ان نغمہ نگاروں نے اپنے فلمی نغموں کو بازاری پن (Vulgarity) کی طرف جانے سے روکا۔ کیفی صاحب جیسے گیت کاروں کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے فلم بینوں کے شوق اور جذبے کو اپنے اعلا اور ارفع ذوق سے ہم آہنگ کیا۔ انھوں نے نئی نسل کے گیت کاروں کی طرح تماشا بینوں کی پسند اور ناپسند کو معیار نہیں بنایا بلکہ اپنا خود ایک معیار قائم کیا اور اس معیار پر تاحیات قائم رہے۔ اس بات کا ثبوت کیفی صاحب کے دلوں میں اتر جانے والے وہ گانے ہیں جنھیں انھوں نے 'حقیقت'، 'شعلہ اور شبنم'، 'ارتھ'، 'کاغذ کے پھول' اور 'ہیر رانجھا' وغیرہ جیسی اپنے وقت کی کامیاب فلموں میں لکھے ہیں۔ آج بھی جب ان گانوں کو ہم سنتے ہیں تو ایک عجیب طرح کا لطف اور سرور ہمیں حاصل ہوتا ہے۔

کیفی اعظمی کی شخصیت کا تیسرا پہلو ڈرامہ نگاری سے متعلق ان کی بے پناہ دلچسپیوں سے متعلق تھا۔ وہ ادیبوں کے ساتھ اپنی اکثر گفتگو میں اس بات پر اظہار افسوس کیا کرتے تھے کہ اردو کی اور اصناف سخن میں تو کافی کام ہوا لیکن ڈرامہ نگاری پر کم توجہ دی گئی۔ ان کا خیال تھا کہ آغا حشر کاشمیری کی کوششیں اس ضمن میں یقیناً لائق ستائش ہیں لیکن ان کے بعد ڈرامے سے متعلق لوگوں کی دلچسپیاں برائے نام تھیں۔ کیفی اعظمی کو اردو زبان میں اچھے ڈراموں کی کمی کا احساس ستاتا رہتا تھا شاید اسی بنیاد پر انھوں نے انڈین پیپلز تھیٹرس ایسوسی ایشن (IPTA) سے اپنا تعلق بہت گہرا اور مضبوط کر لیا تھا۔ وہ اپٹا کے صدر ہی نہیں تھے بلکہ اس کے روح رواں بھی بن گئے تھے۔ اس خاکسار سے ایک نجی گفتگو میں کیفی صاحب نے کہا تھا کہ:

"اپٹا (IPTA) کے وجود میں آنے سے قبل اردو ڈرامے کی دنیا میں ایک طرح کا سناٹا تھا۔ اس سناٹے کو انڈین پیپلز تھیٹر اور ہندوستانی تھیٹر نے ختم کیا۔ جب اپٹا کا قیام عمل میں آیا تو پرتھوی تھیٹر اور ہندوستانی تھیٹر کی کوششوں سے اردو ڈرامے کا آندولن دوبارہ شروع ہوا۔ آج چند شہروں مثلاً دہلی اور ممبئی میں اردو ڈرامہ فروغ کی سمت میں رواں دواں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اردو ڈرامے کے اس فروغ میں عوامی تھیٹر کا اور چند دوسرے گروپوں کا زبردست ہاتھ ہے اور ممبئی میں پرتھوی تھیٹر بننے کے بعد اردو ڈرامے کے آندولن کو ایسی تقویت ملی کہ جس کی کوئی مثال نہیں ہے"۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپٹا کی جانب سے پرتھوی تھیٹر میں جو اچھے اور مقبول ڈرامے اسٹیج کیے گئے وہ کیفی اعظمی مرحوم کی شب و روز کی محنتوں کا خوشگوار نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اردو زبان کیفی صاحب کی اس انوکھی اور نادر نجی خدمت کو کبھی نظر انداز نہیں کر پائے گی۔ یہ بات بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ اردو زبان کی یہ صنف بھی اب اتنی بھرپور ہو گئی ہے کہ اس کے تعلق سے اب ہمیں کسی شرمندگی کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ اس کامیابی

کے لیے اردو دنیا کیفی اعظمی اور ان کے معاونین کی شکر گزار ہے۔

۱۹۹۲ء میں کیفی صاحب پر ایک کتاب "کیفی اعظمی عکس اور جہتیں" کے نام سے شائع کی گئی تھی۔ ۵۰۳ صفحات کی اس کتاب کی ترتیب اور اشاعت کا اہتمام شاہد ماہلی صاحب نے اپنے ادارے معیار پبلی کیشنز کی جانب سے کیا تھا۔ اس جامع اور بھرپور کتاب کے شروع میں تین خصوصی مضامین شامل ہیں جن کے نام اس طرح ہیں: "میں اور میری شاعری"، "کیفی اعظمی میرے ہمسفر"، "کیفی اعظمی میرے ابا" اور "میرا پڑوسی"۔ پہلا مضمون خود کیفی صاحب نے لکھا ہے۔ دوسرا مضمون شوکت کیفی کا ہے جسے انھوں نے اپنے شوہر کیفی اعظمی کے بارے میں سپرد قلم کیا ہے۔ تیسرا مضمون شبانہ اعظمی کا ہے۔ یہ مضمون شبانہ اعظمی نے ایک بیٹی کی حیثیت سے اپنے والد محترم پر تحریر کیا ہے۔ چوتھے مضمون کو اس خاکسار نے کیفی صاحب کے پڑوسی کی حیثیت سے قلم بند کیا ہے۔ جب یہ کتاب میرے پاس آئی تو میں نے کیفی صاحب کا اور کتاب کے مرتب شاہد ماہلی صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے میرے مضمون کو اتنی اہمیت دی۔ کیفی صاحب میرے مضمون سے بہت خوش تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ پوری کتاب میں یہ تنہا مضمون ہے جس میں میرے سوانحی حالات تفصیل سے اور پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ اب کیفی صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں ان کی کمی کا ہمیں احساس ہو رہا ہے۔ ان کے حق میں ہم دعا گو ہیں کہ خدا ان کے ساتھ اچھے معاملات رکھے اور ہم سب کو ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

بقیہ صفحہ ۸ سے آگے

مذکورہ غزل میں کیا کچھ نہیں ہے۔ ہاں اگر نہیں ہے تو عشق کی داستان نہیں ہے۔ گل و بلبل کا ذکر نہیں ہے مگر ایک درد مند دل کی داستان ضرور ہے جو ہمارے نظام میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کو اجاگر کر رہا ہے۔ کیفی اعظمی نے شاعری کو زندگی سے جوڑ کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔ کمزور طبقوں کی بھلائی کے لیے انھوں نے اپنے قلم کو وقف کر دیا تھا۔ وہ ہندوستان کو ہمیشہ ہر طرح کی تفریق سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ وہ غلام ہندوستان میں پیدا ضرور ہوئے تھے مگر ان کی خواہش سوشلسٹ ہندوستان میں مرنے کی تھی ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ کیفی اعظمی کی موت صرف اردو یا ترقی پسند شاعری کی موت نہیں ہے بلکہ ہمارے پورے سماج کے لیے ایک سانحہ ہے اور ایک ایسا نقصان ہے جس کی بھرپائی مشکل ہے۔

کیفی اعظمی کی شریک حیات محترمہ شوکت صاحبہ نے ۱۹۴۷ء میں ان کی زندگی میں داخل ہوئیں اور ایک ہندوستانی عورت کی طرح خود کو کیفی اعظمی کے لیے وقف کر دیا۔ وہ بھی کیفی اعظمی کی طرح کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئیں اور قدم قدم پر اپنے شوہر کے ساتھ رہیں۔ ان کی اولاد محترمہ شبانہ اعظمی اور محترم بابا اعظمی نے اپنے والدین کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی بھرپور کوشش کی اور آج بھی اپنے اپنے میدان عمل میں سرگرم ہیں۔

کیفی اعظمی آخری وقت تک اس تحریک سے وابستہ رہے جس سے انھوں نے اپنی کم عمری میں رشتہ جوڑا تھا۔ وہ انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (IPTA) کے فاؤنڈر ممبر تھے اور اس انجمن کی معرفت انھوں نے بہت سے ڈرامے بھی پلے (Play) کیے ان کا لکھا ہوا پہلا ناٹک "آخری شمع" تھا جو مرزا غالب کو کردار بنا کر لکھا تھا اس کے علاوہ انھوں نے اور بہت سے ناٹک بھی لکھے اور ان کو اسٹیج پر ادا کرائے۔ جسمانی معذوری اور صحت کی خرابی کے باوجود کیفی اعظمی نے ہاتھ پانی اور دونوں ہی طور پر سرگرم عمل رہے۔ وہ کمیونسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک واضح سائنٹفک نظریہ رکھتے تھے اور زندگی کو اسی زاویے سے دیکھتے بھی تھے۔

کیفی اعظمی کی شاعری کے چار مجموعے منظر عام پر آئے۔ پہلا مجموعہ "جھنکار" ۱۹۴۳ء میں، دوسرا "آخری شب" ۱۹۴۷ء میں، تیسرا "آوارہ سجدے" ۱۹۷۳ء اور چوتھا "میری آواز سنو" ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئے۔ آخر الذکر مجموعہ ان کے لکھے ہوئے فلمی نغموں پر مشتمل ہے جو عوام میں بہت مقبول ہیں۔ "آوارہ سجدے" کیفی اعظمی کا یادگار زمانہ مجموعہ ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکادمی کا مخصوص ایوارڈ اور اترپردیش اردو اکادمی کا ساہتیہ ایوارڈ حاصل ہوئے۔ کیفی اعظمی کو نام و نمود کی پروا نہ تھی، وہ عمل کے آدمی تھے اس کے باوجود ان کی ادبی اور ثقافتی خدمات کو خوب سراہا گیا۔ لوٹس ایوارڈ، فلم فیئر ایوارڈ، رائٹرز ویلفیئر لیکٹ ایوارڈ اور پدم شری اعزاز سے نوازا گیا۔ پدم شری اعزاز کو انھوں نے اردو کے ساتھ جانبدارانہ رویہ اپنانے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے واپس کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اردو اکادمیوں نے کیفی اعظمی کو اعزازات دے کر خود کو عزت بخشی۔ کیفی اعظمی کے آخری ایام میں ان کو ساہتیہ اکادمی نے اپنا اعلا ترین اعزاز "فیلوشپ" عطا کیا جس کو کیفی اعظمی بیمار ہونے کے سبب خود وصول نہ کر سکے تھے اور ان کی جگہ یہ اعزاز کیفی اعظمی کی شریک حیات شوکت اعظمی صاحبہ نے قبول کیا تھا۔ "فیلوشپ" اعزاز پانے والے کیفی اعظمی اردو کے دوسرے شاعر تھے۔

کیفی اعظمی کی مشہور نظموں میں تلنگانہ، بنگلہ دیش، ماسکو، عورت، مکان، ابن مریم، بہروپنی اور رام کا بن واس اردو ادب میں ایک مرتبہ رکھتی ہیں جو ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

میں نے کیفی اعظمی کو پہلی مرتبہ ۱۹ رمئی ۱۹۹۰ء کو اجھیانی ضلع بدایوں کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں غزل اور نظم پڑھتے ہوئے دیکھا تھا جب وہ آنجہانی شری کرشن گوئل سابق وزیر حکومت اترپردیش کی عوامی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے منعقد ہونے والے ایک جلسے میں شرکت کرنے اجھیانی آئے تھے۔ وہ ترنم سے غزلیں نہیں پڑھتے تھے کیوں کہ ان کی آواز ترنم کے لیے نہیں تھی وہ عوام کے شاعر تھے اسی لیے عوام کی آواز میں غزلیں اور نظمیں پڑھتے تھے۔ اجھیانی کے مشاعرے میں پڑھے گئے ان کے یہ اشعار آج بھی کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔

دستور کیا یہ شہر ستم گر کے ہو گئے
دیکھا جو مڑ کے ہم نے وہ پتھر کے ہو گئے

اعلان حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد

انساں کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں
دو گز زمیں بھی چاہیے دو گز کفن کے بعد

اور یہ شعر دیکھیے۔

شوریدگی ہی سہ پرندوں نے پایا ہوگا
کوئی جنگل کی طرف شہر سے آیا ہوگا

کیا ایسے اشعار کا خالق شاعر بھی مر سکتا ہے؟ شاید کبھی نہیں۔ وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

☆☆☆

بقیہ صفحہ ۳ سے آگے

مقابلے میں زیادہ قابل اطمینان ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مقابلہ و موازنہ ہی ہماری تگ و دو کی آخری حد ہے۔ درآں حالیکہ سوائے جامعہ عثمانیہ اور ملک کی کوئی ایسی یونیورسٹی نہیں جہاں اردو کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع دیا گیا ہو۔ اگر ہم نے اردو کے معاملے میں ہندوستان کی چند نا قابل یونیورسٹیوں ہی سے علی گڑھ کا مقابلہ کیا اور اس کو بہتر پایا تو یہ ہمارے لیے کچھ زیادہ مسرت کا مقام نہیں، ہم علی گڑھ کو اس کے خاص بلند پایہ معیار پر دیکھنا چاہتے ہیں"۔

۲- سیماب لٹریری سوسائٹی جمشید پور اور بزم ادب جمشید پور کے مابین اختلافات رہے ہوں گے چنانچہ پندرہ روزہ "ہماری زبان" دہلی نے اس تنازعہ پر لکھا ہے کہ "اب صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ادارے ایک دوسرے سے صاف نہیں ہیں"۔

(باقی آئندہ)

☆☆☆

کیفی اعظمی کی یاد میں

تسلیم غوری بدایونی (۲۲۴-۲-سرائے جالندھری، بدایوں [۲۴۳۶۰۱] یوپی)

ابھی بیگم آل احمد سرور کی عدت کی مدت بھی پوری نہ ہو پائی تھی کہ ترقی پسند اردو گھرانے سے وابستہ ایک اور خاتون محترمہ شوکت اعظمی کو بیوگی کی چادر اوڑھنا پڑ گئی یعنی ۱۰ر مئی ۲۰۰۲ء کو ترقی پسند شاعری کا ایک اہم ستون کیفی اعظمی کی شکل میں پیوند خاک ہو گیا۔ تیسری ہزاری کے ابتدائی دونوں سال اردو ادب کے لیے اجل کا پیغام لے کر آئے اور ان سالوں میں اردو قرطاس سے ایسے ایسے جواہر پارے اجل کی نذر ہو گئے جن کے تذکرے رہتی دنیا تک ہوتے رہیں گے۔ مجروح سلطانپوری، علی سردار جعفری، کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر راہی، قتیل شفائی اور پروفیسر آل احمد سرور ایسی بلند پایہ شخصیات کا غم ابھی اردو دنیا بھلا بھی نہ پائی تھی کہ حضرت کیفی اعظمی بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔

کیفی اعظمی جن کا پورا نام سید اطہر حسین رضوی تھا، اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے موضع مجواں میں ایک تعلیم یافتہ شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے مگر افسوس ہے کہ ان کے سنہ پیدائش اور تاریخ پیدائش کا کسی کو علم نہیں یہاں تک کہ خود مرحوم کو بھی اپنی تاریخ اور سنہ پیدائش کی جانکاری نہیں تھی۔ مالک رام نے "تذکرہ ماہ و سال" میں کیفی اعظمی کی تاریخ و سنہ پیدائش ۱۴ر جنوری ۱۹۲۳ء لکھی ہے جب کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ ۱۹۲۳ء کو کیفی اعظمی کا سال ولادت مانتے ہیں۔ ہندی کے معتبر ادیب شمشیر صاحب نے کیفی اعظمی کے شعری مجموعہ "آوارہ سجدے" کے ہندی اڈیشن میں کیفی اعظمی کا سال پیدائش ۱۹۱۸ء لکھا ہے۔ اتنے بڑے ادیب اور شاعر کے صحیح تاریخ و سنہ پیدائش کا علم نہ ہونا اردو حلقے کے لیے افسوس کی بات ہے۔

کیفی اعظمی کے والد سید فتح حسین رضوی چھوٹی سی زمینداری کے مالک تھے جب وہ صاحب اولاد ہوئے تو ان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ زمینداری کی قلیل آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے ہونا مشکل ہیں اس لیے وہ اودھ کی ریاست بلہرہ آگئے اور وہاں تحصیل دار کا عہدہ پانے میں کامیاب ہوئے۔ ملازمت مل جانے کے بعد انھوں نے اپنی بیوی اور بچوں کو بھی لکھنؤ بلا لیا۔ سید فتح حسین رضوی کے سات اولادیں تھیں جن میں سید ظفر حسین، سید یوسف حسین اور سید بشیر حسین کو انگریزی تعلیم دلوائی گئی جب کہ سید اطہر حسین جو بعد کو کیفی اعظمی کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوئے، کو ان کے والد مولوی بنانا چاہتے تھے اس لیے اطہر حسین کو لکھنؤ میں شیعہ فرقے کی سب سے بڑی درس گاہ سلطان المدارس میں داخل کروا دیا گیا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کیفی کے سر میں مذہب کا سودا نہیں تھا وہ مذہب کی انتہا پسندی سے بیزار تھے اسی لیے انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی اور وہ انیس سال کی کم عمری میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے اور ملک کو آزاد کرانے کی دھن میں ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر لیا۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں انھوں نے کمیونسٹ اخبار 'قومی جنگ' میں بھرپور کام کیا۔ ۱۹۴۳ء میں کیفی اعظمی بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا سے اپنا رشتہ جوڑ لیا جہاں انھوں نے متعدد ہندی فلموں کے لیے کہانیاں، نغمے اور مکالمے لکھے اور اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔

کیفی اعظمی کو شاعری وراثت میں ملی تھی، انھوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہاں اردو، فارسی اور عربی شعرا کے دواوین موجود تھے جن کو کیفی اعظمی نے اس عمر میں پڑھ لیا تھا، جب ان کی سمجھ میں اشعار کا کچھ کچھ حصہ آتا تھا۔ کیفی کے والد خود تو شاعر نہ تھے البتہ ان کو شاعری سے دل چسپی تھی جو اس زمانے کے شرفا کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کے برعکس کیفی اعظمی کے تینوں بڑے بھائی شاعری کا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور صاحب دیوان بھی تھے۔ سید ظفر حسین کا تخلص مجروح تھا، سید یوسف حسین کا رجا اور سید شبیر حسین کا وفا۔ اسی لیے اپنے گھر کے علمی ماحول سے متاثر ہو کر سید اطہر حسین نے بھی کیفی تخلص اختیار کیا۔ یہ تخلص ان کو اتنا راس آیا کہ عوام و خواص ان کا اصل نام ہی بھول گئے اور کیفی اعظمی نے شہرت پائی۔ کیفی اعظمی نے اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی، وہ تلمیذ الرحمٰن تھے، انھوں نے اپنے مطالعے سے سب کچھ حاصل کیا البتہ حضرت حتی لکھنوی کی صحبتوں نے کیفی اعظمی کو راہ دکھائی۔ کیفی اعظمی نے گیارہ سال کی عمر میں جو پہلی غزل لکھی تھی اس کے اشعار درج ذیل ہیں۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہرحال چل پڑے
ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر
مے ہے اسی کی نام پہ جس کے ابل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

کیفی اعظمی نے اردو شاعری کی ابتدا تو روایتی شاعری سے ہی کی مگر جیسے جیسے ان کا شعور پروان چڑھا ان کے خیالات اور سوچ میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی۔ وہ اوائل عمر سے ہی نیشنلسٹ خیالات کے آدمی تھے، وہ سرسید کے مقابلے مولانا شبلی نعمانی کو پسند کرتے تھے کیوں کہ سرسید کے خیالات انگریز پرست تھے جب کہ مولانا شبلی نعمانی کا انداز فکر وطن پرست تھا۔ اسی لیے کیفی اعظمی کی سوچ وطن پرست تھی وہ اپنی مادر وطن سے بے پناہ محبت کرتے تھے جس کا اظہار ان کی نظموں اور غزلوں میں نظر آتا ہے۔ وہ کسی سے مرعوب نہ ہوتے البتہ ۱۹۳۶ء میں جب منشی پریم چند کی قیادت میں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن قائم ہوئی تو کیفی اعظمی اس تنظیم سے بہت متاثر ہوئے اور اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس انجمن کے شعرا قدیم شاعری سے بیزار نہیں تھے البتہ وہ گل و بلبل اور عاشق و معشوق کی شاعری سے ضرور بیزار تھے۔ وہ شعری میدان میں کچھ کر گزرنے کی امنگ رکھتے تھے اور ان شعرا نے ایسا کر کے بھی دکھایا۔ مثال کے طور پر کیفی اعظمی کی یہ غزل پڑھیے۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمیں نیا آسماں نہیں ملتا
نئی زمیں نیا آسماں تو مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا
وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا
وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولھے
کہ جن میں شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا
کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمھارے چہرے کا کوئی یہاں نہیں ملتا

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

منشاء الرحمن خاں منشا

اُس کو زمانہ یاد کرے گا

وہ کہ اک فن کار تھا اعلا — قوی ایکتا کا متوالا
طرز سخن تھا جس کا نرالا — ہر پہلو سے تھا جو چیالا
ہو گیا رخصت حیف وہ کیفی
نازش فن تھی جس کی ہستی

ہر دل میں تھی اس کی عزت — راہ تھی اس کی راہ صداقت
اس کی باتوں میں تھی صلابت — اور لہجے میں خاص حرارت
گرم نوائی ختم ہے اس پر
حوصلہ زائی ختم ہے اس پر

اس کی طبع رواں کے جوہر — رنگیں، دلکش، تابندہ تر
نام ہے اس کا سب کی زباں پر — وہ تھا سراپا عزم کا پیکر
ظرف وفا دکھلایا اس نے
'پدم شری' ٹھکرایا اس نے

مہر و وفا کا تھا وہ پیامی — ہستی اس کی نامی گرامی
حصہ تھی اس کی اعلا مقامی — ہے باکانہ صدق کلامی
اب نہ ملے گا ایسا سخنور
برق تپاں ہوں جس کے تیور

اس کے گیت اور اس کی نظمیں — سنتے ہی جب دل میں اتریں
ناممکن ہے پھر اے منشا — اہل جہاں کیفی کو بھولیں
جب تک ذوق شعر رہے گا
اس کو زمانہ یاد کرے گا

ایڈیٹر: خلیق انجم
پرنٹر، پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، نئی دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) ۲ روپے — سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک ۸ امریکن ڈالر)
Phones: 3237210,3236299 Fax: 011-3239547
E-mail: urduadabndli@bol.net.in